صائمہ نیاز
اسکالرپی ایچ ڈی اردو، نیشنل یونیورسٹی آف ماڈرن لینگویجز، اسلام آباد

پی ٹی وی کے اُردو ڈراموں میں عورتوں کے سماجی مسائل

Saima Niaz
Scholar PhD Urdu, NUML, Islamabad.

Reflection of the Social Problems of Women in Urdu Drama's of PTV

Society is composed of social interactions and social shadings. Defining society is a difficult thing, but today, the Sociology is referred as the mother of all sciences. In the social perspective, if we study the social status of woman, she meets the very discrimination in this man-dominant society. Most of the families treat woman in very cruel way and we find a clear-cut discrimination. In most of the areas in Pakistan, most of the women not only work at houses but they also work in the fields which has made their job very highly injurious. Although, this society cannot exist without woman, yet their social status is very low and she is victim to very critical imbalance in her rights. This study reveals what reflection has been realized in the Long Drama Serials of PTV. It aims to scratch the mentioned roles of women and their difficult lives on the other hand. Woman is often victimized in domestic violence, her rights are mostly denied in our Pakistani society . Urdu Literature has been in rising slogans for the liberty of woman from the peters of injustice and cruelty. Beside victimization and violence, her sexual abuses and harassments are at peak in this cruel society.

Key Words: *Social Status of Women, Discrimination, Domestic Violence, Injustice, Critical imBalance, Sexual Abuses.*

سماج یامعاشرہ کے ایک لفظی معنی آپس میں مل جل کر زندگانی کرنا،اوقات بسر کرنااور کسی کے ہم راہ اکھٹا رہنا ہے۔ لفظی مفہوم میں یہ کلمہ جتنا سادہ ہے اتنا ہی اصلاحی معنوں میں پیچیدہ اور مشکل ہے۔یہ اس وقت کی بات ہے جب اصطلاحاتی الجھاؤ میں انسان نہیں پڑا تھا۔ آج معاشریات ایک وسیع علم ہی نہیں بلکہ جتنے بھی عمرانی علوم ہیں اُن سب کا سر چشمہ ہے۔دوسری سماجی علوم کی طرح معاشرہ کی بھی کوئی ایسی تعریف مشکل ہے جس پر تمام ماہرین عمرانیات کا اتفاق ہو۔ وسیع تر مفہوم میں معاشرہ یا سماج انسانوں کے بنائے ہوئے ایک ایسے گروہ پر محیط ہے جو کافی حد تک اچھی اور منظم زندگی گزارتے ہوں۔معاشرے کو عام زبان میں سوسائٹی کہتے ہیں۔اپنے محدود مفہوم میں یہ لفظ بعض مخصوص مقاصد کے حصول

کے تحت کسی تنظیم کے لیے شعوری طور پر استعمال ہوتا ہے ۔ تشریحی لحاظ سے اس کے پیش نظر زندگی کی لاتعداد ضرورتوں کا پورا کرنا ہے۔

عورت کا سماجی صورت حال کے حوالے سے جائزہ لیا جائے تو یہ تلخ حقیقت سامنے آتی ہے کہ ایک محکوم حیثیت سے عورت اپنی زندگی بسر کرتی ہے۔اس معاشرے میں مرد ہی عورت پر اولین دنوں سے تمام فیصلوں پر حاوی ہوتا ہے۔صحت کی سہولتوں کا انتخاب، تعلیم ،نوکری ،شادی حتیٰ کہ زندگی کے تمام شعبوں میں آخری فیصلہ مرد کا ہی ہوتا ہے۔ پاکستانی عورت کی زندگی میں مرد ہی مرکزی کردار ادا کرتا ہے۔

مردوں کے اس بنائے گئے معاشرے میں لڑکیوں سے بچپن ہی سے امتیازی سلوک روا رکھا جاتا ہے۔لڑکوں کے مقابلے میں کم توجہ دینا ، کم کھانا اور دیگر بنیادی سہولتیں نہ دینے کا رجحان عام ہے ۔ آبادی میں شرح زیادہ ہونے کی وجہ سے پاکستانی عورتیں ایک بڑے کنبے کی ذمہ داری اُٹھاتی ہیں ۔اوسطاً سات یا آٹھ بچے شادی شدہ عورت پالتی ہیں۔اپنے شوہر یا سسرال کی مخالفت کے ڈر سے زیادہ تر دیہاتی عورتیں خاندانی منصوبہ بندی کے طریقوں سے گریز کرتی ہیں۔

بچوں کی دیکھ بال ،جانوروں کی نگہداشت ،گھر کی صفائی ،دھلائی، کھانا پکانا اور دیگر کام عورتوں کے سپرد ہوتا ہے۔عورتوں کے ان کاموں کے علاوہ دیہی معاشرے میں عورتیں کھیتوں میں مردوں کے شانہ بشانہ کام میں لگی رہتی ہیں ۔ ان سب کے باوجود عورت کو کوئی اچھی سماجی حیثیت حاصل نہیں۔ہمارے معاشرے میں عورت صحت و تعلیم کی بنیادی سہولتوں سے محروم ہے۔ صدیوں پرانے کلچر سے پاکستانی عورت آج بھی پیوستہ ہے ۔عورت کی تعلیم اور آزادی کو اس کلچر میں ناگوار سمجھا جاتا ہے۔ملک کے بڑے بڑے شہروں میں خواتین ہر شعبے میں نمایاں نظر آتی ہیں مگر جن علاقوں میں زیادہ آبادی رہائش پذیر ہے وہاں یہ خیال کیا جاتا ہے کہ لڑکیوں کو چونکہ کمانا نہیں ہوتا اس لیے انھیں ایسے مضامین کی تعلیم دی جاتی ہے جو گھریلو کام کاج اور امورِ خانہ داری سے متعلق ہوں۔انہیں زیادہ علم و تربیت دینے کی ضرورت بھی محسوس نہیں کی جاتی۔معاشی جبر کے ساتھ عورت سماجی ناانصافیوں کا بھی شکار ہے ۔یورپ میں صدیوں تک عورت محکوم رہی۔ مذہبی طور پر شادی کو مسیحیت میں مقدس مان کر صرف ایک بیوی رکھنے کی پابندی عائد کی گئی۔اس وجہ سے خواتین کی سماجی حیثیت میں بہتری آئی لیکن یہی عیسائی مذہب کا پرچار کرنے والے عورتوں کے سراسر خلاف بھی تھے۔عورتوں کا وراثت میں قانوناً کوئی حصہ نہیں تھا۔عدالت میں جانا ان کے لیے کسی گناہ سے کم نہ تھا۔خاوند کی تشدّد کے خلاف قانونی تحفظ کہیں بھی حاصل نہ تھا۔اعلیٰ خاندان کی عورتوں نے یورپ کی نشاۃ ثانیہ میں آزادی سے مشاغل اپنائے۔ مجلسی آداب کو انھوں نے خوب نکھارا۔نسوانی تزئین و آرائش،لباس،زیور،خوشبو سبھی کچھ ان کی دسترس میں تھے۔یورپ میں آج بھی وہی مجلسی آداب و اطوار رائج ہیں جو اس زمانے میں تھے۔یہ طریقے انھوں نے جلسے جلوس نکال کر نہیں بلکہ اپنی ذہانت اور نفاست کے ایما پر حاصل کیے۔ اس اخلاقی پستی کے دور میں دھوکہ دہی ،قمار بازی،رشوت خوری اور دوسری برائیاں روز بہ روز بڑھتی گئی مگر کوئی فرق نہ آیا۔

"سولھویں صدی عیسوی تمام دنیا میں غیر معمولی قابلیت کے لوگوں کا زمانہ تھا۔انگلستان میں ملکہ ایلزبتھ اوّل اور شکسپیر اور ہندوستان میں اکبر اعظم ،ترکی میں سلیمان اعظم بادشاہوں ، سیاست دانوں،ادیبوں کی ایک مرغوب کرنے والی فہرست سامنے آتی ہے لیکن تضاد دیکھئے کہ انگلستان میں ملکہ ایلزبتھ کی ہوش مندی اور صلاحیت کا ہر شخص قائل تھا لیکن عورتوں کو سیاست میں حصہ لینے کی اجازت تک نہ تھی۔آکسفورڈ اور کیمبرج میں نئے کالج قائم ہوئے۔ملکہ ایلزبتھ آکسفورڈ اور کیمبرج گئیں اور استادوں اور طلبہ سے خطاب کیا،لیکن کوئی کالج یاسکول لڑکیوں کے لیے قائم نہ ہوا۔"(۱)

یہ وہ دور تھا جب سائنسی مزاج اور معقولیت کا غلبہ تھا مگر اس میں بھی عورت کی محکومیت میں کوئی تبدیلی نہ آئی۔یہ وہ زمانہ تھا جب شوخ وچنچل،خوش باش اور خوش گفتار عورتوں سے ملکہ ایلزبتھ کا دربار ہر وقت بھرا ہوا ہوتا تھا۔تمام عورتیں جو دربار میں رہتی تھیں بڑے لوگوں ،امراء اور روساء کی بیٹیاں تھیں۔ان درباری خواتین کے علاوہ تمام عورتیں اپنے خاوند کی خدمت اور امورِ خانہ داری میں مصروف رہتی تھیں۔اس زمانے میں فرانس جو تہذیب وتمدن کا گہوارہ سمجھا جاتا تھا، میں بھی عام عورت کی حیثیت انگلستان کے عورت جیسے ہی تھی۔ سپین میں اس وقت بادشاہت عروج پر تھی۔گھر کی چار دیواری میں شریف عورتیں بند رہتی۔مرد کے ساتھ مل بیٹھ کر کھانا کھانا گناہ عظیم سمجھا جاتا تھا۔ڈولی میں سوار ہو کر یہ عورتیں باہر جاتیں۔ان ممالک کے مقابلے میں ہالینڈ کی حالت اس وقت کچھ مختلف تھی۔یہاں تعلیم کا معیار بلند،موسیقی اور پھولوں سے عشق،صاف ستھرا ماحول اور تحریر وتقریر کی کھلی آزادی تھی افتخار شیروانی کہتے ہے۔

"مشہور فلسفی ڈیکارٹ کا بیان تھا کہ دنیا کا کوئی بھی دوسرا ملک آزادی اور محفوظ شہری ماحول، جرائم کی کمی اورآداب کی شائستگی میں ہالینڈ کا مقابلہ نہیں کر سکتا اس ماحول میں عورتیں آزاد تھیں، تعلیم میں مصروف تھیں اور ہنر مند بیویاں اور اورمائیں تھیں۔"(۲)

مردوں نے ہمیشہ عورت کو اپنی ظلم و جبر اور تعصب کا نشانہ بنایا۔مردوں نے خود عورتوں کے حقوق وفرائض کے دائرے بڑے تعصبانہ انداز فکر سے متعین کر دیئے۔ساجد علی لکھتے ہے۔

"عورتوں اور مردوں کے جداگانہ دائرہ کار کا تصور فطرت کے کسی قانون پر مبنی نہیں بلکہ معاشرتی رسم ورواج اور عادات کا نتیجہ ہے۔"(۳)

مرد اور عورت ایک دوسرے کے بغیر نامکمل ہے اگر ان میں کوئی بھی اپنی ذمّہ داری سے دست بردار ہو جائے تو کائنات کا سارا نظام درہم برہم ہو جائے۔یہ فطرت و معاشرت کے خلاف ہے کہ مرد کو ہی اہم ،برتر وعقل کُل سمجھا جائے۔ بانو قدسیہ تحریر کرتی ہے۔

"مرد اپنی الجھنوں کو عورت کی اعانت کے بغیر سلجھا نہیں سکتا کیوں کہ روپے کے چاہے دورُخ ہو،روپیہ

ہمیشہ ایک ہوتا ہے۔ یہ جب بھی Devaluate ہوتا ہے تو اس کے دونوں رُخ ایک وقت میں
بے حیثیت ہو جاتے ہیں۔"(۴)

اگر ہم عورت کو صرف اکتساب لذت کا ذریعہ، مرد کے جذبہ شہوانیت کی تسکین اور بچے پیدا کرنے والی ایک مشین سمجھ لے تو معاشرے میں ہر سُو بگاڑ پیدا ہو جائے گا۔ عورت قوموں کی تہذیب و تمدن کے عروج و زوال میں بنیادی اہمیت رکھتی ہے۔ ان کے وجود و حیثیت سے انکار بے جا، نامناسب و غیر منصفانہ ہو گا۔

یہ حقیقت ہے کہ دنیا میں ہر چیز کی تخلیق کا ایک مقصد ہوتا ہے اور اسی طرح محرک، بنیاد، وجود، کردار، مرام اور نتیجے کا ایک اخلاقی، فلسفیانہ اور ادبی سلسلہ شروع ہوتا ہے۔ اب اُسی رشتے کو ابدی قرار دیا جاتا ہے جن کا جوڑ احترام آدمیت اور مساوات انسانیت سے ثابت ہوتا ہے۔ کائنات بھر میں جہاں اور مخلوقات کو فرائض اور سلوک کی وجہ سے مختلف درجات حاصل ہیں وہاں عورت کو سب گھر، چار دیواری، ماحول اور ریاست کے لیے معتبر اور مقدس کردار مانتے ہیں۔ یہ عورت وہ مایہ ہے جس سے اندھیر وادیوں، تاریک راستوں اور سیاہ منزلوں کو روشن تر بنایا جا سکتا ہے۔ اس کردار کو اس لحاظ سے مایا بھی کہا جاتا ہے کہ اس کے واسطہ سرابوں اور گمشدہ کہانیوں اور داستانوں کو حقیقی اور دائمی شکلوں میں دیکھا جا سکتا ہے۔

عورت کسی بھی سماج کا وہ ازلی کردار ہوتا ہے جس سے انہونی کو ہونی اور ناممکن کو ممکن صورت میں مطالعہ اور مشاہدہ کرنا نہایت آسان ہوتا ہے۔ مشکلات، مصائب اور تکالیف کو برداشت کرنا اور اُن کو اپنی ذات میں چھپا کر کرم و تبسّم، خوشی و دل فریبی اور ایثار و قربانی کا مظاہرہ کرنا اسی عورت کا کام مانا جاتا ہے۔ اس عورت کو ایک طرف گھر، خاندان، نسل، معاشرے، کنبے اور زندگی کا فعال حصہ تسلیم کیا جاتا ہے تو دوسری طرف اس کو پورا گھر اور مکمل سماج بھی کہا جاتا ہے اب ظاہر ہے کہ جس شے، جسم، نام اور حیثیت سے کسی بھی ابتداء ترقی اور تشکیل کی باقاعدہ شروعات ہوتی ہے اُسی پر تکمیل اور کاملیت کا سفر بھی اختتام پذیر ہوتا ہے اگر واقعی اس قاعدے یا اصول کو قطعی یا تاکیدی مانا جاتا ہے تو پہلا نام بھی عورت کا ظاہر ہوتا ہے اور آخری مرتبہ بھی اُسی عورت کو دیا جاتا ہے۔ الغرض ایک عورت ذاتی اور انفرادی طور پر بھی ایک دائمی جہاں کے برابر ہوتی ہے اور کل و اجتماعی لحاظ سے بھی امر کہلاتی ہے۔ اسی طرح چاہے کوئی بھی جمود، حرکت، رجحان، تحریک، نظریے یا عقیدے کا مسئلہ ہو تو روز اول ہی سے عورت کو بنیادی کردار سے یاد کیا جاتا ہے۔

اب اگر ادب ایک جانب رکھ رکھاؤ، احترام، تکریم اور عزت سے پیوستہ ایک حقیقت کا نام ہے تو ساتھ ساتھ احساسات، جذبات، رجحانات، میلانات، خیالات اور فکریات کو ظہور دینے اور اُن کو باقاعدہ طور پر ایک تخلیقی صورت عطا کرنے والی ان مٹ سچائی بھی ہے۔ اگر کسی بھی جگہ یا ذہن سے اسی کو باہر کیا جائے یا اس کو غیر ضروری مان کر دور رکھا جائے تو واقعی ایسا عمل کسی بھی حساس اور ذمہ دار سماج اور اس سے بڑھ کر انسان و انسانیت کے حق میں نہیں ہے۔ گذشتہ عصر، زمانہ، حال اور مستقبل کے حالات پر رائے دینا ہو، گنج اصل کشید کرنا ہو، اصل نقل میں لکیریں کھینچنا ہو، عارضی و ابدی میں امتیاز کرنا ہو اور انسانیت و حیوانیت کی نشاندہی کرنی ہو تو زیادہ تر ادب کی طرف رجوع کرنا پڑتا ہے۔ جس طرح عورت کے بغیر کوئی بھی چار دیواری اور بستی صحیح معنوں میں ترقی اور خوشحالی سے ہم کنار نہیں ہو سکتی اُسی طرح ادب کو چھوڑ کر بھی آدم

مکمل طور پر اپنی معراج کو پا نہیں سکتا۔ اگر عورت کو جاننا ہو تو ادب کا مخصوص مطالعہ ضروری ہوتا ہے، دوسری طرف عورت کو پل پل جس طرح جینا ہوتا ہے اور دشوار ترین مراحل اور آزمائشوں سے گزر کر قرار واقعی کے لیے تگ و دو کرتی ہے تو ادب ہی وہ مایہ ہے جو اس ایثار پرست یا جاوداں کردار کو معلیٰ مقام سے فیض یاب کر سکتی ہے۔ عورت اور ادب کا تعلق اور وصال ایک اٹل سچائی ہے۔ ان دونوں کے ساتھ سے وہ حالات بھی آشکارہ ہوئے ہیں جن سے اُجڑے دیاروں اور آباد گھروں کا پہیہ چلتا ہے۔ ان دونوں کا جوڑ اُن مراحل اور اقدامات کا ظاہر ہونا بھی ہے جن سے کبھی کبھار آدم وحشت کا شکار ہوتا ہے اور بعض اوقات یہی انسان اشرف المخلوقات کا درجہ پا لیتا ہے۔ ایک کردار کے پاس جتنے گم یا پوشیدہ خزانے ہوتے ہیں تو دوسرا کردار یعنی ادب اُن کو ظہور دیتا ہے اور یوں جہاں اُنگلی اُٹھانے کی ضرورت ہوتی ہے تو لوگ سر اُٹھا کر یہی فریضہ سر انجام دیتے ہیں اور جہاں تک خاک اور خون کو چنگاریوں اور شکلوں میں بدلنا لازمی ہوتا ہے تو وہاں پر عملی اُمور بھی ملاحظہ ہوتے ہیں۔ مختصر یہ کہ عورت کو مستحکم اور اکمل مقام و مرتبہ دلانے میں ادب کی مثال جِلا کی ہوتی ہے اور ادب کو دائمی شکل اختیار کرنے یا دینے میں عورت واقعی مایا سے کم نہیں ہوتی اور ان دونوں کا سنگم اور سنگت وقت اور تمام تر حالات، حادثات، ارشادات، تخلیقات، تحقیقات، نتائج اور سفارشات سے حق و سچ ثابت ہے۔ عالمی ادب کا ایک اہم موضوع عورت ہے۔ عورت کے مسائل اور عورت کے خلاف امتیازی رویہ مشرق اور مغرب دونوں میں نظر آتا ہے۔ پاکستانی عورت کے بہت سارے مسائل اور مطالبات وہی ہیں جو دنیا کے باقی عورتوں کو درپیش ہیں۔ مغرب کی عورت تعلیم، صحت اور کام کے مساوی مواقع حاصل کر چکی ہے جب کہ ان حقوق کے حصول سے پاکستانی عورت آج بھی محروم ہے۔ اپنے حقوق کے حصول میں عورت کو جو رکاوٹیں اور مشکلات درپیش ہیں اُن کا تعلق مرد کی سوچ اور نظریات سے ہے۔ مرد عورت کے وجود کو تسلیم کرنے کے لیے تیار نہیں اور عورت کو ثانوی حیثیت دیتے ہوئے زندگی کے کسی میدان میں برابر حقوق کا حامل وجود ماننے سے انکاری ہے۔ عورت جس کو سماج، ادب اور تنقید و تحقیق کے پس منظر میں ایک بنیادی کردار مانا جاتا ہے اسی طرح فن و عمل کے لحاظ سے بھی معتبر مرتبے پر فائز نظر آتی ہے اور اس کو ذہنی، جسمانی اور روحانی طور پر جس طرح مختلف مسائل کا سامنا رہا ہے اُن کو حقیقت جان کر برائے اصلاح دکھایا گیا ہے۔ عام آدمی سے لے کر ایوان اقتدار میں بیٹھے اشرافیہ تک عورت کو جس طرح پستی اور بدحالی میں مزے سے قابل احترام ملاحظہ کیا جاتا ہے وہ ایک تلخ سچائی ہے۔ ویسے تو تحریکوں کی برکت سے عورتوں کے جلی و خفی مسائل کو وجود ملا ہے مگر پاکستان ٹیلی وژن وہ واحد ادارہ ہے جس نے طویل دورانیے کے اردو ڈراموں میں خواتین سے منسوب چھوٹے بڑے ،سماجی، معاشی، بنیادی، امتیازی اخلاقی، تعلیمی، روایتی، مقامی، قومی، فکری، بدنی، روحانی اور کرداری وغیرہ مسائل کو بہترین انداز میں ظاہر کیا ہے۔

ٹیلی وژن کے اردو ڈراموں میں ایک بڑا نام مُنو بھائی کا ہے۔ ڈرامے "دروازہ" میں اس نے دو مرکزی کردار سلطان اور زرینہ کے ذریعے شہری اور دیہاتی زندگی کے آئینے میں مال دولت، جاگیرداری، ظاہری محبت، بغیر مشاورت کی شادی، گھر سے بغاوت، والدین کے کردار، جذباتی پن، گھر سے بھاگنا، دھوکہ دہی اور طلاق جیسے مسائل کے ہاتھوں عورت کی اندوہ ناک زندگی کو سامنے رکھا ہے۔۔ مصنف نے اس سلسلے میں عورت کو نہایت قیمتی بتایا ہے کہ یہ مرد کو زندگی دیتی ہے،

سماج کے تیروں کو برداشت کرتی ہے، والدین کا لاج رکھتی ہے، شوہر کو آسمان مانتی ہے، مُنہ میں زبان رکھتی ہے مگر چپ رہتی ہے، تکالیف کا سامنا کرتی ہے، کچھ رشتوں کو دوسروں کی خوشی کے لیے قربان کرتی ہے، دھوکہ کھا کر بھی ہنسی خوشی زندگی گزارتی ہے، اپنے گھر کو آباد کرتے کرتے بعض اوقات طلاق تک پاتی ہے مگر کسی کے پاس اتنا وقت نہیں ہوتا کہ وہ ذرین مایا کو بنیادی حقوق فراہم کر سکے اور اس کو عورت کی بجائے انسان مان کر افضل قرار دیں۔ ہر کوئی اس کو ٹھوکر مارتا پھرتا ہے اور یوں اس بے نظیر کردار کو حقیر جان کر سماج اور زمانے کے مکروہ لوگوں کے تھپیڑوں کے لیے اکیلا چھوڑا جاتا ہے۔ یہ ڈرامہ ۸۱ء کے طویل دورانیے کے سلسلے کا اہم نفسیاتی کھیل ہے۔ یہ نفسیاتی کھیل مرد و عورت کے نفسیات کا بخوبی احاطہ کرتا ہے۔ اس ڈرامے کا موضوع اس کی کہانی سے زیادہ گہرا اور موثر ہے۔ اس ڈرامے میں منّو بھائی ایک ایسے دروازے کی نشاندہی کر رہے ہیں جو انسانی ذات کے اندر کھلتا ہے اور ان اسرار و رموز سے پردہ اُٹھاتا ہے جس کو دیکھنے کے لیے بصارت نہیں بصیرت کی ضرورت ہوتی ہے مگر مادہ پرست اور مادیت پسند لوگوں پر یہ دروازہ نہیں کھلتا۔ سلمان بھٹی کہتے ہیں۔

> " یہ دروازہ ہر شخص کو دکھائی نہیں دیتا۔ اس کے لیے ریاضت کی ضرورت ہے یہ ریاضت اور کٹھن مراحل طے کرنے کے بعد ہی انسان اس دروازے کو اپنی خواہش کی تکمیل کے لیے حاصل کر سکتا ہے۔ یہ دروازہ صرف سچائی اور نیک سوچ رکھنے والے انسا کو نظر آتا ہے۔"(۵)

پاکستان ٹیلی وژن کے طویل دورانیے کے اردو ڈراموں میں حسینہ معین بھی ایک معروف ڈرامہ نویس ہیں۔ ۱۹۸۳ء ڈرامہ "روشنی" میں دو طبقات کے کرداروں عدنان اور ندا کے ذریعے عورت کو کچھ بنیادی مسائل میں قید دکھایا گیا ہے۔ یتیم عدنان کو ماموں بڑا کرتا ہے اور آگے جا کر ندا سے شادی کرتا ہے۔ ندا اور عدنان کے درمیان ہوٹل میں ہونے والی گفتگو ملاحظہ کیجیے۔

"عدنان: (ندا کی طرف پیار سے دیکھتے ہوئے) تم خوش تو ہو نا۔

ندا: ہوم م م م۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔ بہت۔

عدنان: (پلیٹ کو دیکھتے ہوئے) کوئی پچھتاوا تو نہیں۔

ندا: (عدنان کی آنکھوں میں آنکھیں ڈال کر) کوئی پچھتاوا نہیں۔

عدنان: ہماری قسم؟

ندا: ہلکا سا بھی نہیں۔

عدنان: اچھا بات یہ ہے کہ تم اس طرح سے خوش کیوں ہو، شاید اس کی وجہ یہ بھی ہو گی کہ میں بہت اچھا ہوں۔

ندا: اس کی وجہ یہ بھی ہو سکتی ہے کہ میں بہت اچھی ہوں ہر جگہ خوش رہتی ہوں۔

عدنان: (ندا کو گہری نگاہوں سے دیکھتے ہوئے) کہی تم اس وجہ سے تو خوش نہیں کہ تم بس خوش ہی رہتی ہو، تمھیں کوئی پروا ہی نہیں۔

ندا: ڈرتے کیوں ہو۔

عدنان: دیکھو ندا، کئی دفعہ ڈر لگتا ہے میں رات، رات کو سوتے اچانک اٹھ جاتا ہوں کہ تم سوئی ہوئی ہو گی یا واپس اپنے پرستان چلی گئی ہو گی۔

ندا: یہ کیوں نہیں سوچتے کہ واپس کہا جاؤں گی، میں وہاں آئی ہوں جہاں ساری دنیا ختم ہو جاتی ہے، سارے راستے ختم ہو جاتے ہیں واپس جانے کا کوئی راستہ نہیں رہتا۔ تم واپس جانے کا کہو گے تب بھی واپس نہیں جاؤنگی۔"[۶]

ہمارے ہاں امیری غریبی کا کھیل برسوں سے جاری ہے۔ بعض اوقات گھر، زندگی اور انسانیت کو محفوظ دکھایا گیا ہے اور زیادہ تر احترام انسانیت اور مساوات آدمیت کے رشتے کو پارہ پارہ بتایا گیا ہے۔ ندا اپنی مرضی سے عدنان سے شادی کر کے ایک عجیب مسئلے سے دوچار ہوتی۔ اس کو گھر سے متفرق اشیا ملتی ہے جو عدنان کو بالکل پسند نہیں ہوتی ہے یوں دونوں کے مابین فاصلے جنم لیتے ہیں یہی چیز اس جوڑے کو علیحدگی تک لے آتی ہے۔ یہاں پر عورت کو دو پاٹ میں تقسیم دکھایا گیا ہے کہ ایک طرف پیسہ اور عیش و آرام کی زندگی ہے اور دوسری طرف مفلسی اور بے بسی سے معمور حیات ہے، یوں وہ فیصلہ کرتے کرتے اپنی زندگی کو ہارتی ہے۔ حسینہ معین تحریر کرتی ہے کہ کس طرح ایک عورت تن تنہا ایک دولت کدے، ایک فقیر خانے، ایک اونچے طبقے، ایک نیچے طبقے اور سب سے بڑھ کر ذات پات میں منقسم ایک معاشرے میں جی رہی ہوتی ہے۔ وہ فیصلہ کرتے کرتے ایک طرف نامرادی پاتی ہے مگر اصل میں وہ سرمایہ اور مایہ اپنے آپ کو فراہم کرتی ہے جس کو حقیقی زندگی کہتے ہیں۔

حسینہ معین کے اس ڈرامے کے اختتام پر یہی نتیجہ نکلتا ہے کہ ندا ان ظاہری رشتوں اور دولت سے معمور حوالوں کو بھول کر اپنے مجازی خدا کی اس خدائی کو بسر و چشم قبول کرتی ہے جس کو محبت و مودت کہا جاتا ہے۔ وہ مادی دنیا اور وقتی لذتوں کو چھوڑ کر اس جانب رجوع کرتی ہے جہاں عدنان رہتا ہے جہاں ذہنی و روحانی خوشیاں ہوتی ہیں اور وہ زندگی اختیار کر لیتی ہے جس کو عرف عام میں حیات جاوداں پکارا جاتا ہے۔

بانو قدسیہ کا تخلیقی ڈرامہ "چٹان پر گھونسلہ "۱۹۸۱ء میں لکھا گیا ہے۔ اس میں حنا اور ہمایوں نے مرکزی کردار ادا کیے ہیں۔ ایک سڑک حادثے کی وجہ سے دونوں کی ملاقات ہوتی ہے اور حنا زخمی ہمایوں کو گھر لے آتی ہے۔ والدین کی مشاورت کو پس پشت رکھ کر حنا ہمایوں سے شادی کرتی ہے۔ یہ شوہر انا وانانیت میں پڑھ کر ہیروئن سے محبت کا رشتہ توڑ دیتا ہے اور دولت کا پجاری بن کر اس کو تنہا چھوڑ دیتا ہے۔ حنا اور ہمایوں کے درمیان ہونے والی بحث ملاحظہ کیجیے۔

"ہمایوں: غالباً تمہارا خیال ہے کہ تم بزنس میں شیئر ہولڈر ہو کیوں کہ میں نے ایک زمانے میں تم سے ڈیڑھ لاکھ روپیہ لیا تھا۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔یہ لو شکریہ کے ساتھ واپس۔

حنا: یہ یہ۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔یہ کیا ہے ہمایوں ؟

ہمایوں: میں آپ کا اور آپ کے باپ کا ہر مال احسان اتار دینا چاہتا ہوں اور میں کوشش کرتا رہوں گا۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔میری تم سے اتنی ریکویسٹ ہے کہ تم میری زندگی میں انٹرفیئر نہ کرو۔" (۷)

منقولہ مکالمہ بالکل واضح طور پر اس بات کو سامنے لاتا ہے کہ ہمایوں ہر حقیقت اور ہر شے کو پیسے کے تناظر میں تول کر دیکھتا ہے۔ جس کے سامنے انسانی احساسات و جذبات کی کوئی قدر نہیں۔ بانو قدسیہ دراصل یہ نتیجہ اخذ کرتی ہے کہ ہمیں یہ بات ملحوظ خاطر رکھنا چاہیے کہ جو شخص خون کے رشتوں کی پروا نہیں کرتا اور قطع تعلق کر لیتا ہے وہ دوسروں سے کیسے وفا کر سکتا ہے۔ ہمایوں کے اس طرح کے رد عمل سے حنا ایک خاموش پتھر کی مانند ساری زندگی گزارتی ہے۔ پاکستان ٹیلی وژن کے اس طویل ڈرامے میں ایک عورت کو مرد پر اعتبار کر کے اور لاکھ ایثار کر کے دُکھوں کا بُت ظاہر کیا گیا ہے۔ ادھر والدہ کی ناراضی اور اپنی مرضی کے ہاتھوں سماج اور خاندان میں ناستورہ قرار دی جاتی ہے اور اُدھر شوہر ہمایوں کی دغہ بازی، بے رخی اور خود غرضی سے ذاتی طور پر پارہ پارہ ہو جاتی ہے۔ ایسے میں وہ جیتے جی مر جاتی ہے اور ہر لحاظ سے بے آسرا ہو کر اور قسمت کو ذمہ دار ٹھہرا کر انسان و انسانیت سے دور ایک تن تنہا کوٹھے پر صبح شام کرتی ہے۔

ڈرامہ "آنکھ مچولی" میں سیما کو ایک ایسے کردار میں رکھا گیا ہے جو آدمی کو "مرد" سمجھ کر پیار کرتی ہے۔ بے شک وہ غربت دیکھتی ہے اور رنگ و نسل کے اعتبار سے نچلے طبقے سے تعلق رکھتی ہے مگر وہ نظر، قدر اور پیار کے لحاظ سے ایک کھرا کردار ہوتا ہے۔ وہ پٹھان مرد روشن خان کو دل دے بیٹھتی ہے اور اس کی مردانگی پر مر مٹتی ہے۔ ہیرو اپنی اس پچارن کو باہر جانے، غیر مردوں اور والد سے بے ادبی سے بات کرنے اور پرائی دیواروں پر چڑھ کر دیکھنے سے منع کرتا ہے۔ کوئی مستقل رشتہ نہ ہونے کے باوجود بھی سیما اس پر جان چھڑکتی ہے۔ ادھر یہ عورت ویسے بھی خوبصورت نہیں ہوتی ہے اور اوپر سے غریبی کے واسطے ایسے ایسے کام سرانجام دیتی ہے جن کو معاشرہ اچھا نہیں سمجھتا۔ یہ دونوں کردار بعد میں اپنی اپنی راہ لیتے ہیں۔ روشن خان واپس سوات جا کر شادی کر لیتا ہے اور سیما ایک میراثی ڈھول بجانے والے کی بیوی بنتی ہے۔ اس کام سے سیما کو نفرت ہوتی ہے اور وہ شوہر کے اس عمل کو مردانگی کے خلاف مانتی ہے۔ وہ ڈھول کو دفع کرتی ہے اور ذہنی بیمار ہو کر ایک شخص کی جدائی، مرد و مردانگی کی ممات اور ایک صحیح سورما کی دلیری وجواں مردی نہ پانے کی وجہ سے نفسیاتی مریضہ بن جاتی ہے۔

ان دونوں ڈراموں میں عورت کو ایک گھر اور گھرانے کے اندر بے بس اور مرد کے ہاتھوں شکست یافتہ تحریر کیا گیا ہے۔ بتایا گیا ہے کہ ایک خاتون ان گنت قربانیوں اور محبتوں کا مظاہرہ کرے اور اپنی خواہشات اور ترجیحات کو گُم جان کر اپنے شوہر، والدین اور بچوں کی خوشیوں کے لیے سب کچھ کرے مگر اس کو وہ مرتبہ حاصل نہیں ہوتا جو اس کے قدرتی، بنیادی اور اخلاقی حقوق میں شامل ہوتا ہے۔ یوں ایک عورت کے ساتھ یہ انسانیت سوز ظلم ایک زمانے سے جاری ہے اور نجانے کب تک رہے گا۔

اس میں کوئی دوسری رائے نہیں ہوسکتی کہ ہر دور میں کائنات سے لے کر گھر و گھرانے تک عورت کو ایک خاص تکریم حاصل رہی ہے۔ چاہے ایک عورت ذات کے حوالے سے زیر مطالعہ ہو، سماج میں کردار کے ضمن سے زیر نظر ہو یا ادب میں نام و مقام کے اعتبار سے زیر غور ہو، تو ہر انفرادی و اجتماعی اظہار خیال میں وہ مرکزی گردانی جاتی ہے۔ بد قسمتی سے بعض معاشروں اور حالتوں میں اسی عورت کو کاغذی اور وقتی قابل احترام ہستی تو تسلیم کیا جاتا ہے مگر دائمی اور ابدی لحاظ سے اس کو وہ عزت اور محبت حاصل نہیں ہوتی جس کی یہ قدرتی، پیدائشی، بنیادی، اخلاقی اور قانونی طور پر حق دار ہے۔

پاکستان ٹیلی وژن ایک ایسا قومی ادارہ ہے جس کے طویل دورانیے کے اردو ڈراموں میں خواتین کے حوالے سے چھوٹے بڑے مسائل کی بے مثال عکاسی کی گئی ہے۔ ماضی تا حال زیادہ تر کھیلوں اور ڈراموں میں خواتین سے متعلق تعلیم، غربت، جاہلیت، بے روزگاری، علاج معالجہ، محبت، شادی، جہیز، پردے، امتیازی سلوک، اظہار رائے، نوکری، رشتے، تشدد، اولاد، خاندانی روایت، دشمنی، جاگیر، جائیداد، وراثت اور استحصال وغیرہ کو خوب دکھایا گیا ہے۔

متفرق ادیبوں اور قلم کاروں نے مختلف زاویوں اور زریعوں سے عورتوں کو درپیش مسائل کی نشاندہی کی ہے اور یہ نتائج اخذ کی ہیں کہ عورت جس روپ اور کردار میں ہو تو اس کو مقدس و مقدم خیال کرنا ضروری ہوتا ہے۔ بے شک بعض اوقات کمی بیشی اور مدو جذر موجود ہوتا ہے اور اصلاح و فلاح کا مرحلہ بھی ایک حقیقت ہے مگر زیادہ تر عورت کو نفرت و حقارت کا سامنا کرنا پڑتا ہے۔ یہ تماشا ہر گز نہیں ہے اور نہ کوئی ڈمی یا اضطراری وجود ہے کہ جب چاہے اس کو اپنے فائدے کے لیے استعمال کرو اور وقت گزرنے کے بعد جہاں چاہو، پھینک دو۔

بس یہ فقید المثال ہستی ہے جس کے ہونے سے کائنات بھر میں اور دنیا کے گوشے گوشے میں خوشیوں اور خوشبوؤں کے رنگ عام ہیں اور انسان و انسانیت کی بقا کو حقیقی جان کر عورت کو تمام بنیادی اور قانونی حقوق عطا کرنے، اس کو درپیش مسائل بروقت حل کرنے اور ختم کرنے کی طرف ٹھوس اقدامات کی اشد ضرورت ہے۔ اس کے ساتھ وہ تمام تر آئینی احکامات اور قانونی ارشادات کو عملی جامہ پہنانے کی بھی واقعی ضرورت ہے جن کے تحت عورت کو ہر قسم کی قدرتی، سماجی اور اخلاقی آزادی ملی ہوئی ہے اور جن پر عمل کرکے عورت کے ظاہری و باطنی اور انفرادی و اجتماعی مسائل کو بہترین انداز سے حل کیا جاسکتا ہے۔

حوالہ جات

۱۔ افتخار شیروانی، عورتوں کی محکومیت، فیروز سنز لاہور، بار اوّل، ۱۹۹۳، ص،۹

۲۔ ایضاً، ص،۹

۳۔ لیلیٰ احمد، عورت جنسی تفریق اور اسلام، (مترجم) خلیل احمد، مشعل لاہور، ۱۹۹۵، ص،۸

۴۔ بانو قدسیہ، حوّا کے نام، سنگ میل پبلی کیشنز، لاہور، ۲۰۰۷، ص،۵

۵۔ :سلمان بھٹی محمد، پاکستان ٹیلی وژن ڈراموں میں سماجی حقیقتیں، مجلس لاہور، ۱۹۸۴، ص،۷

۶۔ www.youtube.ptvlongplays.com

۷۔ بانو قدسیہ، فٹ پاتھ کی گھاس، فیروز اینڈ سنز، لاہور، ۱۹۸۹ص ۵۸،۵۷